قیام گاہ مرزا غالب محلہ راج دوارہ، رامپور۔

جائے رہائش مرزا غالب، بلیماران دہلی

مسجد کے زیرِ سایہ اک گھر بنالیا ہے

جائے ولادت مرزا غالبؔ، آگرہ
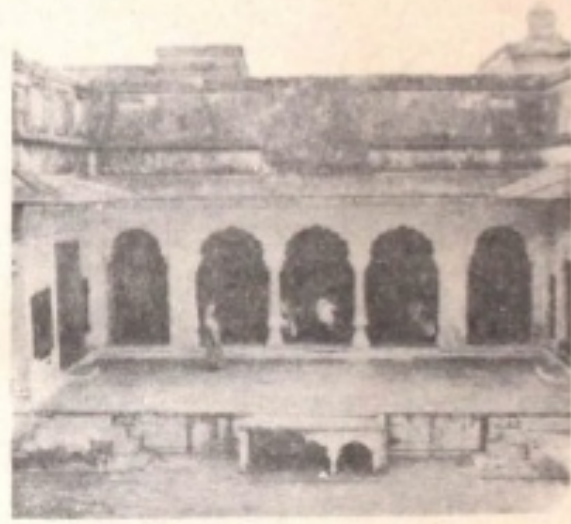
۱-۲- کلاں محل ۳-۴- کٹڑہ گڈریوں والا-

مزار مرزا غالب، قرب نظام الدین اولیاء دہلی

الف

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا (۱) کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ (۲) صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

جراحت تحفہ الماس ارمغاں داغِ جگر ہدیہ (۶) مبارکباد اسدؔ! غمخوارِ جانِ دردمند آیا

(۱) اس شعر کو بعض شارحین نے بے معنی قرار دیا ہے جو کہ سراسر بے انصافی ہے جبکہ اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے مرزا صاحب نے عبدالرزاق شاکر کو لکھا ہے کہ "ایران میں رسم ہے کہ داد خواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے جیسے مشعل دن کو جلانا یا خون آلودہ کپڑا بانس پر لٹکا کر لے جانا۔ پس شاعر خیال کرتا ہے کہ نقش کس کی شوخیِ تحریر کا فریادی ہے کہ جو صورتِ تصویر ہے اُس کا پیرہن کاغذی ہے یعنی ہستی اگرچہ مثلِ تصاویر اعتبارِ محض ہو موجب رنج و ملال و آزار ہے۔"

(۲) جوئے شیر دودھ کی نہر شیریں کے عاشق فرہاد نے کوہ بے ستون کو عرصہ دراز کی محنت سے کاٹ کر نہر کو نکالا تھا۔ کہتے ہیں کہ شیریں کا ہمراز شاپور اپنے دوست فرہاد کو شیریں کے پاس لایا۔ فرہاد شیریں کو دیکھتے ہی فریفتہ ہوگیا اور جب اس کے عشق کا چرچا پھیلا تو خسرو کو بھی پتہ چل گیا۔ اُس نے سزا کے طور پر فرہاد سے کہا کہ شیریں کو تازہ دودھ ملنے میں دقت ہے اگر وہ کوہ بے ستون کاٹ کر اُس کے لیے دودھ کی نہر محل کے نیچے لے آئے تو شیریں کو پا سکتا ہے۔ خسرو کو یقین کامل تھا کہ یہ محال کام فرہاد سے نہ ہو سکے گا اور ایفائے وعدہ کا موقع کبھی نہ آئے گا۔ مگر عاشق زار ایسا مصروف ہوا کہ برسہا برس کی مشقت سے ناممکن کام کو بھی ممکن بنا دیا۔ جب وعدہ کا موقع آیا تو خسرو نے ایک مکار بڑھیا کے ذریعہ جھوٹی خبر اڑا دی کہ شیریں مر گئی ہے جس کو سنتے ہی فرہاد نے اپنے تیشے سے سر پھوڑ کر خود کو مار ڈالا۔ فرماتے ہیں:
ہجر کی رات کاٹنی اتنی مشکل ہے جتنی فرہاد کو نہر کے لانے میں ہوئی تھی۔

(۶) جراحت: زخم۔ الماس: ہیرا جس کے چاٹنے سے آدمی مجروح ہو جاتا ہے اور جس کا سفوف زخم پر چھڑکنے سے سخت تکلیف ہوتی ہے۔ ارمغان: تحفہ۔ اسدؔ غالب کا پہلا تخلص۔ اے اسدؔ مبارک ہو کہ تمہاری دردمند جان کا ہمدردِ عشق اس شان کے ساتھ ملنے آیا ہے کہ جگر کے داغ اور الماس جیسے تحفے اپنے ہمراہ لایا ہے۔

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا

آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
مَیں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ (۶)
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

کہتے ہو نہ دیں گے ہم، دل اگر پڑا پایا
دل کہاں، کہ گم کیجے؟ ہم نے مدعا پایا

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا

دوستدارِ دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا

سادگی و پُرکاری، بیخودی و ہشیاری
حُسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل
خُوں کیا ہوا دیکھا، گُم کیا ہوا پایا

حالِ دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈا تُم نے بارہا پایا

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تُم نے کیا مزا پایا!

(۶) کوہکن کا عشق کامل نہ تھا ورنہ شیریں کی موت کا علم ہوتے ہی اُس کی جان نکل جاتی لیکن اُس نے اپنے مرنے کے لیے تیشے کا استعمال کیا۔ ایک عاشق کی یہ شان ہے کہ مرنے کے لیے کسی ذریعہ کا محتاج نہ رہے۔
مرزا صاحب کوہکن کی موت پر طنز کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ عشقِ کامل کا درجہ بہت بلند ہے کوہکن وہاں تک نہ پہنچ سکا رُسوم و قیود نے اُسے مرنے کے لیے تیشہ کا محتاج بنا دیا۔ عشقِ کامل ان پابندیوں سے ہمیشہ آزاد ہے۔

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں؟
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا (۱)
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی یارب! (۲)
تیر بھی سینۂ بسمل سے پر افشاں نکلا

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد
کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

تھی نو آموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالبؔ
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

---

(۱) اس شعر کا مطلب مرزا صاحب نے مولوی عبدالرزاق شاکر کے خط میں اس طرح لکھا ہے۔
"رقیب بمعنی مخالف، شوقِ سر و ساماں کا دشمن ہے۔ دلیل یہ ہے کہ قیس جو زندگی میں ننگا پڑا پھرتا تھا تصویر کے پردے میں بھی ننگا ہی رہا۔ لطف یہ ہے کہ مجنوں کی تصویر باتنِ عریاں ہی کھنچتی ہے جہاں کھنچتی ہے۔"

(۲) اس شعر کے متعلق مرزا صاحب نے شاکر کو لکھا ہے۔ یہ ایک بات میں نے اپنی طبیعت سے نکالی ہے جیسا کہ اس شعر میں ہے۔
"نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں ٭ وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیے" یعنی زخمِ تیر کی توہین بسبب ایک رخنہ ہونے کے اور تلوار کے زخم کی تحسین بسبب ایک طاق سا کھل جانے کے۔ زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی یعنی زائل نہ کیا تنگی کو۔ پر افشاں بمعنی ...ب اور یہ لفظ تیر کے مناسبِ حال ہے۔ معنی یہ کہ تیر تنگیِ دل کی داد کیا دیتا وہ تو خود تنگیِ مقام سے گھبرا کر پر افشاں اور سراسیمہ نکل گیا

دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا (۱) عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا
تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا
تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا
دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب اس رہگزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا
جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا
احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا
یہ لاشِ بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے (۷) حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا (۸) تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا
بفیضِ بیدلی نومیدیِ جاوید آساں ہے کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا
ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریِ قاتل کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

(۱) فرہاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہم نے صرف عشق کی دھمکی میں آکر ہی اس کی طرح جان نہیں دی، بلکہ ہم تو مردانگی کے ساتھ عشق اور مصائبِ عشق کا مقابلہ تمام عمر کرتے رہے۔

(۷) اسدِ خستہ جان کو خدا بخشے عجیب آزاد مرد تھا۔ لاش کے لیے بھی پابندِ کفن ہونا گوارا نہ کیا اور اپنی آزادی مر کر بھی برقرار رکھی۔

حضرت ذوق نے بھی اپنی موت کے متعلق اسی قسم کا شعر کہا ہے ؎

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

(۸) یہ مطلع اور اس کے بعد کے دو شعر مرزا صاحب کے ابتدائی کلام کا نمونہ ہیں۔ ابتدائی کلام میں مرزا صاحب کے یہاں بیان کی پیچیدگی اور فارسیت بہت زیادہ ہوتی تھی۔ فرماتے ہیں ہمارے محبوب کو ایک ہی ہاتھ سے سو سو دل اڑا لینے کا مشغلہ پسند ہے اس لیے اس مشکل پسند محبوب کو تسبیح کے سو دانوں کو شمار کرنے کا مشغلہ پسند ہے۔

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا | ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا
سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا (۴) | یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا
میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں | وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی | گر نفس جادۂ سر منزلِ تقوی نہ ہوا
ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی | گوش منت کشِ گلبانگِ تسلی نہ ہوا
کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے | ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا
مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب (۷) | ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا | وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا
بیاں کیا کیجیے بیدادِ کاوش ہائے مژگاں کا | کہ ہر یک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا
نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو | لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا
دکھاؤں گا تماشہ دی اگر فرصت زمانے نے | مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا
کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے | کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

(۴) مرزا صاحب نے سانپ اور زمرد کے متعلق چودھری عبدالغفور کو اس طرح لکھا ہے: "قبولِ دعا وقتِ طلوع منجملہ مضامینِ شعری ہے جیسے کتاں کا پرتوِ ماہ میں پھٹ جانا اور زمرد سے افعی کا اندھا ہو جانا۔"
دمِ افعی۔ سانپ کی پھنکار۔ زمرد۔ سبز رنگ کا قیمتی پتھر جس کے دیکھنے سے سانپ اندھا ہو جاتا ہے۔ آصف الدولہ والیِ اودھ نے اس کا تجربہ کیا۔ سانپ کے سامنے زمرد رکھا لیکن سانپ اندھا نہ ہوا۔ مرزا صاحب نے اس کی تائید میں سبزۂ خط کو زمرد اور زلف کو سانپ سے تشبیہ دے کر یہ مضمون پیدا کیا ہے۔
(۷) دمِ عیسیٰ۔ عیسیٰ کی پھونک۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک زبردست پیغمبر گزرے ہیں ان کے ماننے والوں کو عیسائی کہتے ہیں۔ مسلمان بھی ان کو پیغمبر مانتے ہیں۔ ان کا یہ معجزہ تھا کہ اپنی پھونک سے مردہ زندہ کر دیا کرتے تھے۔
فرماتے ہیں مسیحا نے مجھے حیات دینے کے لیے لب ہلائے مگر میری ناتوانی کو جنبشِ لب بھی گراں گزری اور یہ صدمہ میں برداشت نہ کر سکا۔ جو جنبشِ لب زندگی بخشنے والی تھی میرے لیے موت کا باعث بن گئی۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرمِ دہقاں کا

اگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ، ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے
دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ
سبب کیا خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا!

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالبؔ
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بیدماغی ہے
کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

تو اور سوئے غیر نظرہائے تیز تیز!
میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا وگرنہ میں
طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اس گرہِ نیم باز کا

تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسدؔ
سینہ کہ تھا دفینہ گہرہائے راز کا

بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا (۱) رکھیو یارب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا

شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا (۲) اس تکلف سے کہ گویا بتکدہ کا در کھلا

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب؛ آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا

گو نہ سمجھوں اسکی باتیں گو نہ پاؤں اسکا بھید پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

ہے خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول آج ادھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا

کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

اسکی امت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند؛ (۱۰) واسطے جس شہ کے غالبؔ گنبدِ بے در کھلا

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا شعلۂ جوالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا

واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام گریہ سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

(۱) ان مشاعروں کی طرف اشارہ ہے جو حضرت بہادر شاہ ظفر کی زیرِ سرپرستی قلعہ معلی میں ہوا کرتے تھے اور جن میں مرزا صاحب بھی شرکت کیا کرتے تھے (۲) دوسرے شعر میں مشاعرہ کی چہل پہل اور رونق کو بتکدہ کے حسن و جمال سے تشبیہ دے کر ایک لطیف بات پیدا کر دی ہے۔

(۱۰) مقطع میں مرزا صاحب نے شبِ معراج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ میں اُن کی اُمت میں ہوں جن کے لیے عرش پر جاتے وقت آسمان کے دروازے کھل گئے تھے۔ پھر میرے کام کس طرح بند رہ سکتے ہیں وہ بھی کھل جائیں گے۔ معراج اہلِ اسلام کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک رات حضرت محمدؐ کو دیگر انبیاء سے اُن کا درجہ بلند کرنے کے لیے عرش پر بلایا تھا۔ رسول اللہ ایک خاص سواری (براق) پر سوار ہو کر آسمانوں کا فاصلہ طے کر کے اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچے تھے۔

مرقعِ غالبؔ

مع حواشی

تلمیحات و تشریحاتِ اشعار مندرجہ مکتوبات
وعکسِ خطوطِ منتخب نوشتہ مرزا غالبؔ

مرتبہ
پرتھوی چندر

اشاعت — پہلی بار

سال — ۱۹۶۶ء

تعداد — دو ہزار

مطبوعہ — لکشمی پرنٹنگ ورکس دہلی

خوش نویس — حفیظ صدیقی

ملنے کے پتے

۱۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ: جامعہ نگر، نئی دہلی
اردو بازار، دہلی ۶

۲۔ لکشمی بک سٹور، ۷۲ جن پتھ ۔ نئی دہلی

۱۴/ر

پرتھوی چندر
۷۲ جن پتھ، نئی دہلی